# ترقی پسند ادب کی شعری جمالیات

## تعارف

(محمد امتیاز احمد)

اُردو کی ادبی تاریخ میں ترقی پسند ادبی تحریک کئی اعتبار سے اہم ہے۔ اس تحریک نے جہاں ایک طرف اُردو ادب کو نئے موضوعات فراہم کیے وہیں اسلوبِ بیان کی سطح پر بھی ادبی اصناف تغیر وتبدل سے آشنا ہوئیں نیز ہیئت وتکنیک کی حوالے سے بھی ادب کو نئی لیل ونہار کا مشاہدہ کرایا۔ ناول کے ساتھ ساتھ افسانہ نے ترقی اور توقیر کی کئی منزلیں طے کیں جب کہ غزل کے مقابلے میں نظم کو رواج عطا کیا گیا۔ زیرِ نظر مقالہ میں ترقی پسند ادبی تحریک کی شعری جمالیات کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا۔ مقالہ نگار نے حتی المقدور اپنی تحقیقی اور تنقیدی صلاحیت کو بروئے کار لا کر اس تحریک سے وابستہ نمائندہ شعرائے کرام کے شعری اختصاصات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے فیض احمد فیضؔ، اسرار الحق مجازؔ، ساحرؔ لدھیانوی، مخدوم محی الدین، معین احسن جذبیؔ، سردارؔ جعفری کے شعری اقتباسات پیش کر کے مقالے کا حق ادا کر دیا ہے۔ دراصل ترقی پسند ادبی تحریک کارل مارکس اور فریڈرک اینجلز کے افکار وخیالات سے نہایت حد تک متاثر تھی بلکہ اُردو کے ترقی پسند ادبا کو طنزاً مارکس کے ڈھنڈورچی کہا جاتا تھا، مقالہ نگار نے مذکورہ ترقی پسند شعرا پر مارکسیت اور اشتراکیت کے اثرات کا بھرپور جائزہ لے کر اُن لفظیات اور اصطلاحات پر بھی صحت مند گفتگو کی ہے جو ترقی پسند شاعری سے ہی مخصوص ہیں۔ یہ مقالہ ترقی پسند شاعری کے انقلابی، احتجاجی، مزاحمتی اور اضطراری پہلوؤں پر بھی عمدہ طریقے سے روشنی ڈالتا ہے۔

**اہم لفظیات:** خون، انقلاب، مارکسیت، اشتراکیت، سماجی حقیقت نگاری، تشدد، ترقی پسندی، احتجاج، مزاحمت، شعری جمالیات، بغاوت، بورژوا، پرولیتاریت۔

۱۹۳۵ء میں پیرس میں عالمی ادیبوں کی ایک کانفرنس ''تحفظِ ثقافت'' کے لیے منعقد ہوئی۔ جس میں ادب کے تعلق سے کئی اہم مسائل پر روشنی ڈالی گئی۔ اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ادیب سرمایہ دارانہ نظام اور عوام پر ہو رہے ظلم وستم کے خلاف اپنی تحریروں میں روشنی ڈالیں۔ اس بارے میں Carlo Coppola لکھتے ہیں کہ:

"The meeting organized by the writers was called the international congress for the Defence of Culture and met in Paris from 21-26 June 1935, in the Palais de la Mutabilite. Some two hundred writers attended; the number of countries represented varies according to whom one reads". 1

جو کہ E. M. Forster کے مطابق ۱۹/ اور Christina Stead کے مطابق ۳۹ تھی۔ خالد علوی لکھتے ہیں:

''پہلی بار دانشوروں نے منظّم طور پر اپنے تہذیبی ورثے کی حفاظت کے لیے آواز اٹھائی تھی۔ ہندوستانی ادیبوں کی نمائندگی ایک پارسی خاتون صوفیہ ڈارنے کی۔ ''انگارے'' کے مصنفین میں سے سجاد ظہیر بھی ملک راج آنند کے ساتھ اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔ اس طرح ''انگارے'' اور اس کے مصنّفین ترقی پسند تحریک کے بانی ٹھہرے''۔۲

گویا اس تصور کے واضح اثرات ہمارے ادب میں ''انگارے'' ۱۹۳۲ء کی اشاعت پر پڑے۔ ۵/ اپریل ۱۹۳۳ء کو "The leader" الہ آباد میں ''ترقی پسند مصنّفین'' کا اعلان نامہ شائع کیا گیا اور احمد علی کی ''شعلے'' ۱۹۳۴ء (افسانوی مجموعہ) کی اشاعت کے بعد یہ اثرات تیز تر ہونے لگے۔ ۱۹۳۶ء میں باضابطہ اُردو ادب میں اس تحریک کی بنیاد پڑی اور ''ترقی پسند تحریک'' "All-India Progressive Writers Association" کہلانے لگی۔ احمد علی کا کہنا ہے کہ:

"The basic fact is that the movement did not start in 1936, but in 1932, and was publicly announced in 1933".Pp-3

لکھنو کانفرنس کے اعلان نامے اپریل ۱۹۳۶ء میں انھوں نے اس کے مقاصد اس طرح بتائے تھے:

۱۔ تمام ہندوستانیوں کے ترقی پسند مصنّفین کی امداد سے مشاروتی جلسے منعقد کر کے لٹریچر شائع کر کے اپنے مقاصد کی تبلیغ کرنا۔

۲۔ ترقی پذیر مضامین لکھنے اور ترجمہ کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور رجعت پسند رجحانات کے خلاف جدوجہد کر کے اہل ملک کی آزادی کی کوشش کرنا۔

۳۔ ترقی پسند مصنّفین کی مدد کرنا۔

۴۔ آزادئ رائے اور آزادئ خیال کی حفاظت کرنا۔[۴]

اس تحریک سے وابستہ افراد نے مارکسی نظریات کے زیر اثر ادب تخلیق کیا اور اس کی بھرپور ترجمانی کی۔ انھوں نے غمِ دوران کو اپنا موضوع بنایا، اپنی ذات اور غمِ جاناں کو کم اہمیت دی، اس کے بجائے عالمی سیاست اور سماجی مسائل میں دلچسپی لینے لگے، جمالیاتی قدروں اور فنی پابندیوں کو غیر اہم جانا، پروپیگنڈہ کو مستحسن قرار دیا، رمزیت واشاریت، تشبیہ واستعارہ کے بجائے واضح اور صاف اظہار بیان کو فروغ دیا، غم یاس، افسردگی کو معیوب جانا، شعر و شاعری میں محض حسن وعشق کی رودادوں کے بجائے عام انسانوں کے مسائل کو بیان کرنے پر زور دیا اور مزدور کو ادب کا اہم کردار بنایا۔ یہ سب سنی سنائی تک ہی محدود نہ رہا بلکہ اس کو ترقی پسندوں کا فارمولہ قرار دیا گیا جو کہ اس طرح تھا:

۱۔ ''ترقی پسند شاعر وہ ہے جو غم دوراں کو اپنی شاعری کا موضوع بنائے۔ غمِ جاناں، غمِ ذات یا انفرادی احساس اور تجربے کو موضوع بنانا فرار اور رجعت پسندی کی علامت ہے۔

۲۔ شاعر آزادی اور انقلاب کی جدوجہد میں بین الاقوامی سیاست پر ہر آن نظر رکھے اور ہر ملک کے بارے میں لکھنے کی کوشش کرے۔

۳۔ فن کی جمالیاتی قدریں، ہیئت کا تناسب اور اس کی تکمیل، دائمی تاثر اور اس طرح کی دوسری اصطلاحیں بورژوا نقادوں کی وضع کی ہوئی ہیں۔

۴۔ جولوگ یہ کہتے ہیں کہ ترقی پسند شاعری پروپیگنڈہ کی شاعری ہے اوراس کی ادبی قدر و قیمت زیادہ نہیں ہے وہ دراصل سرمایہ دارانہ نظام کے حامی ہیں۔ ہر ادب پروپیگنڈا ہوتا ہے۔ ہم انسانی زندگی کو بہتر بنانے کا پروپیگنڈا کرتے ہیں اس لیے یہ مستحسن ہے۔

۵۔ ادب وشاعری میں رمزیت واشاریت زوال پسندوں کا رجحان ہے، ترقی پسند شاعری واضح اور کھلی ڈلی ہونی چاہیے۔ ظلم کو ظلم کہنے کے لیے استعارہ وتشبیہ کی حاجت نہیں۔

۶۔ ہر ترقی پسند شاعر کو رجائیت پر عقیدہ رکھنا چاہیے۔ غم، اداسی، افسردگی اوراس طرح کی کیفیتیں اوران کا بیان معیوب ہے۔

۷۔ جو شاعر، عالمگیر عوامی جدوجہد اوراس سے متعلق تمام واقعات کو موضوعِ شعر بنانے سے گریز کرتا ہے اس کا سیاسی شعور خام ہے اور وہ اپنے فریضے سے غافل ہے۔

مندرجہ بالا فارمولے پر عمل کرنے کے بعد جس قسم کی ترقی پسند شاعری سامنے آئی اس کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کی تکلیف دہ یکسانیت ہے۔ ترقی پسندوں کی نظموں میں ضرورت سے زیادہ چیخ و پکار، بے جا خطابت کے مظاہرے، الفاظ اور خیالات کی تکرار، مصنوعی اور بناوٹی رجائیت اور حقیقی احساس وجذبے کا زبردست فقدان ہے، ان نظموں کے اسلوب اور طرزِ بیان میں ایسی مماثلت اور مشابہت ہے کہ اگر ان کے اوپر سے نام ہٹا دیے جائیں تو یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ نظم کس شاعر کی ہے''۔۵

ادب میں طے شدہ فارمولوں کے بجائے تخلیقی قوتوں کی بنیادی اہمیت ہے۔ ادب اوراس کے فنّی تقاضوں کو اس کی اقدار اور روایات کو اشتراکیت کے پرچار کے لیے بھینٹ نہیں چڑھایا جاسکتا مگر ہمارے ترقی پسند مصنّفین اوپر کے بیان کردہ فارمولہ اور منشور کے تحت بڑے ہی جوش وخروش، شوق وذوق سے کام (شاعری) کررہے تھے اسی کے تقاضوں کے مطابق وہ اپنے جذبات وخیالات کو بھی ڈھالنے پر کاربند تھے۔ ان کے خیالات واحساسات تو اپنے تھے مگر ان کو فکری غذا مارکس وانجلز، لینن واسٹالن کی تحریروں سے فراہم ہورہی تھی۔ ان کا مقصد سیاسی تھا اور اور سیاست ہمیشہ تلوار، جنگ، بغاوت، فرار کی بنا پر چلتی ہے اوراس تحریک کے ادیبوں نے مارکسیت واشتراکیت کو مذہب کی طرف اپنایا تھا۔ غرض اشتراکیت (Communism) کو اپنا عقیدہ، مارکس کو اپنا رہبر اور ماسکو کو اپنا کعبہ تسلیم کیا تھا۔ ان کی

سب سے بڑی کمزوری یہی تھی کہ وہ اس کو الہامی بلکہ وحی سمجھے اور اس پر اس طرح سر دھنتے رہے کہ جیسے آج تک ایسا کوئی نظریہ وجود پذیر ہی نہ ہوا تھا، لہٰذا اب وہ ہر معاملے کو اسی کی عینک سے دیکھنے لگے اور اسی ذہنیت سے سوچنے لگے، اس کے بغیر انھیں نہ تو کچھ نظر ہی آتا تھا اور نہ ہی ان کے خیالات کو اس سرحد سے باہر قدم رکھنے کی اجازت تھی۔ تاریخ عالم میں یہ حقیقت تواتر سے ثابت ہے کہ عقیدہ مذہب اور قائد کہے بنا ہر ایک انسان اپنا سب کچھ نچھاور کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا وہ اپنی ساری حس اسی کی تشہیر، تعلیم و تبلیغ میں لگا دیتا ہے اور اپنا ہر کام منشور کے عین مطابق کرنے کی ہی ممکن سعی کرتا ہے۔ مارکسیت کا نعرہ چوں کہ ''سرخ انقلاب'' کا تھا اس لیے اس ''سرخ انقلاب'' کو روبہ عمل لانے کے لیے جنگ، بغاوت اور اس سے منسوب سارے حربے استعمال کرنے ضروری تھے۔ ترقی پسند ادیبوں کو یہاں کے ''لیڈر'' سجاد ظہیر و رشید جہاں نے بالخصوص تاکید کی تھی وہ اس ''سرخ انقلاب'' کے لیے لوگوں کے دلوں کو گرما دیں، ان کے دلوں میں شعلے بھر دیں، ان کو سرخ رنگ کے پیرہن پہنانے دیں، ان کو آمادہ جنگ کریں، ان کو فساد کے لیے تیار کریں، سرمایہ داروں کی لوٹ مار کے فضائل و کمالات ان کو بتائے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس طرح کی شعلہ انگیز شاعری ہمیں ہر ادیب کے ہاں مل جاتی ہے جس میں کسی خاص آلہ کار پر زور دیا گیا ہے۔

اب ذرا ترتیب وار اس دور کے کچھ کثیر الاستعمال استعاروں کی مثالیں ملاحظہ فرمائے:

آگ، الاؤ، انگارے، شعلہ اور شرر:

مجاز اور مخدوم کی ذہنی نسبت یکساں ہے۔ خیالات و جذبات کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں الفاظ کے انتخاب اور استعمال کا انداز بھی ملتا جلتا ہے۔ مجاز کی ''انقلاب''، ''نوجوان سے'' ''بتانِ حرم''، ''نوجوان خاتون سے'' اور مخدوم کی ''باغی''، ''موت کا گیت''، ''زلف چلیپا''، ''جنگِ آزادی'' تو ایک ہی لے میں ہیں۔ مجاز جذبات کی رَو میں بہے ہی چلے جاتے ہیں جب کہ مخدوم ایک مقام پر آ کر ٹھہر جاتے ہیں مجاز کے ہاں خون کا رقص ہے تو یہاں آگ کے شعلے اور اس کی لپٹیں ہیں:

رعد ہوں برق ہوں بے چین ہوں پارا ہوں میں — خود پرستار، خود آگاہ خود آرا ہوں میں

میری فریاد پے اہل دل انگشت بہ گوش — لا، تبر، خون کے دریا میں نہانے دے مجھے

آگ ہوں آگ ہوں ہاں دہکتی ہوئی آگ　　آگ ہوں آگ بس آگ لگانے دے مجھے

'باغی'' (مخدوم)

زلزلو، آؤ دہکتے ہوئے الاؤ آؤ　　بجلیو آؤ گرج دار گھٹاؤ آؤ

آندھیو آؤ جہنم کی ہواؤ آؤ　　آؤ یہ کرۂ ناپاک بھسم کر ڈالیں

''موت کا گیت''(مخدوم)

درداور جنگ میں کوئی میل نہیں اے دل طیش میں آتشِ جرار کہاں ہے لاؤ

لاؤ، سلگاؤ کوئی جوش غضب کا انگار

وہ دہکتا ہوا گلزار کہاں سے لاؤ

''درد آئے گا دبے پاؤں'' (فیض)

دلوں میں آگ، نگاہوں میں آگ، باتوں میں آگ گھبرا اٹھے (اٹھا) ہے ظلمت

کبھی تو یوں بھی نکلتی ہے غمزدوں کی برات

شب سے تو بارہا

دونوں میں آگ دونوں میں شعلہ

نالے ہمارے لب پہ شرر بار آئے ہیں (جذبی)

دونوں بجلی کے خاندان سے

بحوالہ ''دو چراغ'' (سردار جعفری)

خون، لہو، کفن:

ان شعرا میں مجاز کے ہاں سرخی بہت زیادہ ہے، رخسار کی سرخی، لبوں کی سرخی، خون کی سرخی، فیض نے تو صرف کہا ہی تھا مگر مجاز نے تو حقیقتاً خونِ دل (انسان) میں انگلیاں ڈبوئی ہیں۔ اس لیے اس کے قلم سے سیاہی نہیں بلکہ خون ہی ٹپکتا ہے۔

| | |
|---|---|
| خون کی بُو لے کے جنگل سے ہوائیں آئیں گی | خون ہی خون ہوگا نگاہیں جس طرف بھی جائیں گی دشت میں خوں |
| جھونپڑوں میں خوں، محل میں خوں، شبستانوں میں خوں | وادیوں میں خوں، بیابانوں میں خوں، دیر میں خوں، |
| | مسجد میں خوں، کلیساؤں میں خوں |
| پرسکوں صحرا میں خوں، بے تاب دریاؤں میں خوں | ڈوب جائیں گے چٹانیں خون کے طوفانوں میں |
| خون کے دریا نظر آئیں گے ہر میدان میں | ریگ صحرا میں نظر آئیں گے لاکھوں لالہ زار |
| خون کی رنگینیوں میں ڈوب جائے گی بہار | نرگس مخمور چشم خون فشاں ہوجائے گی |
| خون سے رنگین بوستان ہوجائے گی | جابجا آبادیوں میں آگ سی لگ جائے گی |
| کوہساروں کی طرف سے سرخ آندھی آئے گی | ''انقلاب'' (مجاز) |
| سر سے پا تک ایک خونیں راگ بن کر آؤں گا | لالہ زار رنگ و بو میں ایک راگ بن کر آؤں گا |
| | ''دلی سے واپسی'' (مجاز) |
| بتاؤں کیا تجھے نغموں کے کرب کا عالم | لہو لہاں ہوا جارہا ہے سنۂ ساز |
| | ''تخلیق کا کرب'' (سردار جعفری) |

تلوار، کدال، خنجر، بندوق، توپ:

سردارؔ جعفری، مجازؔ، مخدومؔ، افتخار جالبؔ، جوشؔ کی طرح خطیبانہ وراہنمایانہ انداز رکھتے ہیں، وہ شاعری سے زیادہ تقریر کرتے ہیں اور اس فن میں ماہر وطاق ہیں، جذبات میں اُبال پیدا کرنا، جنگ کے لیے آمادہ کرنا، دشمنوں سے نفرت کرنا سرمایہ داروں کی گردن مارنا، بستیوں کو جلانا، خون کے دریا بہانا، تباہی مچانا کوئی ان سے سیکھے۔ وہ ایک ٹھیٹھ کمیونسٹ ہیں۔ آپ چاہیں تو ان کو سرخ انقلابی بھی کہہ سکتے ہیں ان شعرا میں ساحرؔ، مجروحؔ اور جذبیؔ کی لے فیضؔ کی طرح نرم ہے باقی دماغوں میں شورہ کا مادہ بھرا ہوا ہے۔ موخر الذکر شعراء ''میدانِ اشتراکیت'' میں ڈرڈر کے آہستہ روی سے اور خراماں خراماں داخل ہوتے ہیں۔ جب کہ اول الذکر ہاتھوں میں کدال، پھاوڑا، چاقو، کلہاڑی، بلمیں، بھالیں اور تلوار لیے ''نعرہ مارکس ولینن'' نعرہ اشتراک یا کمیونزم'' چنگھاڑتے ہوئے کود پڑتے ہیں:

مرے عزیزو، مرے رفیقو/ مری کمیونزم کچھ نہیں ہے

یہ عہدِ حاضر کی آبرو ہے/ مری کمیونز زندگی کو
حسین بنانے کی آرزو ہے/ اے ایک معصوم جستجو ہے
تم اپنے تیشے اٹھا کے لاؤ/ میں لے کے اپنی کدال نکلوں
ہم اپنے تیشے کی ضرب کاری/ سے ان کے سینوں کو چھید ڈالیں

مرے عزیزو، مرے رفیقو

دراصل سلطانہ (سردار جعفری کی بیوی) نے ان کو ایک خط لکھا تھا کہ یہ لوگ آپ کی کمیونزم سے خائف ہیں۔ اسی خوف کو دور کرنے کے لیے وہ میدان میں تقریر کرنے کے لیے اترا اور اپنی گھن گرج کے ساتھ اس کی حمایت کرنے لگے:

شعلے کی طرف انجمن شعلہ رخاں ہے — شمشیر بکف لشکرِ اعدائے وطن میں
تلوار کی آغوش میں فولاد کے مانند — تیشے کی طرح کارگہہ شیشہ گراں ہے
''سورنگ'' (سردارؔ جعفری)

یہ وہ بہشت ہے جہاں عیش وسکوں حرام ہے — تیغ و سناں ہے زندگی، تیر و کماں ہے زندگی
''زندگی'' (سردارؔ جعفری)

وہ چمکتی ہوئی آئی ترے سر پر شمشیر — مژدۂ طفلکِ معصوم جھپک! جلد جھپک
سینۂ خاک سے پھر اٹھے گا وہ شور نشور — گنبدِ تیرۂ افلاک بھی تھرائے گا
''میری شاعری اور نقاد'' (جذبیؔ)

سردارؔ جعفری کے نزدیک تو زندگی زندگی نہیں بلکہ تیغ وسناں اور تیر وکماں ہے اور مجازؔ کے نزدیک تو اشتراکیت کا مقصد ہی خون خرابا، فساد اور قتل و غارت گری ہے اس وجہ سے کہ حصولِ اشتراکیت اس کے بغیر ممکن نہیں وہ کمیونزم کو ہر حال میں منطبق دیکھنا چاہتے ہیں۔ انہی ہر وقت اسی کا خیال اسی کی فکر دامن گیر رہتی ہے۔ وہ پہروں پہروں اسی سوچ میں گم رہتے ہیں اس لیے جب یہ سوچ شاعری میں ڈھل جاتی ہے تو الفاظ کے بجائے انگارے، شرارے اور شعلے چھوڑ دیتی ہے۔ محبت، اخلاص، ہمدردی اور ترحم کے برعکس نفرت، کدورت، بغاوت اور ستم کی بجلیاں برسا رہی ہیں۔ جس کی وجہ سے اس کی ساری زندگی (شاعری) خون میں لتھڑی ہوئی ہے۔ سردارؔ جعفری کدال لے کر نکلے تھے تو مجازؔ تلوار لے کر

اٹھتے ہیں:

نکیلی، تیز سنگینیں ہیں، خون آشام شمشیریں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھا جاتا ہوں
حکومت کے مظاہر جنگ کے پر ہول نقشے ہیں
کدالوں کے مقابل توپ، بندوقیں ہیں نیزے ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھا جاتا ہوں
سلاسل، تازیانے، بیڑیاں، پھانسی کے تختے

بحوالہ ''اندھیری رات کا مسافر'' (مجاز)

دیکھ شمشیر ہے یہ، ساز ہے یہ، جام ہے یہ — تو جو شمشیر اٹھا لے تو بڑا کام ہے یہ

''ایک جلاوطن کی واپسی'' (مجاز)

اور مخدوم بھی تو کسی سے کم نہیں وہ بھی درانتی و تیر لے کر میدان میں کود پڑتے ہیں:

بجلیاں جس کی کنیزیں، زلزلے جس کے سفیر — جس کا دل خیبر شکن جس کی نظر ارجن کا تیر

''حویلی'' (مخدوم)

چمک رہی ہے درانتی اچھل رہے ہیں کدال — بنائے قصر امارت شکستۂ و پا مال

''تلنگانہ'' (مخدوم)

فیض کو بھی نشتر ہی علاج معلوم ہوتا ہے:

نغمہ جراح نہیں مونس و غمخوار سہی — گیت نشتر تو نہیں، مرہم آزار سہی
تیرے آزار کا چارہ نہیں، نشتر کے سوا

بحوالہ ''مرے ہمدم مرے دوست'' (فیض)

ان کے آگے جو بھی آتا ہے وہ 'ست سری اکال' پکار کے اس کی گردن کو اڑا کر اپنی ناانصافیوں کا بدلا لینا چاہتے ہیں۔

اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں ان (ترقی پسندوں) پر جنوں طاری تھا۔ جس کا اعتراف 'مجاز' جیسے شاعر نے خود ہی کیا ہے:

ان دنوں مجھ پر قیامت کا جنوں طاری تھا
سر پر سرشاریٔ عشرت کا جنوں طاری تھا
ماہ پاروں سے محبت کا جنوں طاری تھا
شہریاروں سے رقابت کا جنوں طاری تھا
''اعتراف'' (مجاز)

بغاوت، اتحاد، مزدور:

متحد ہو کے اٹھے ظلم کے قدموں سے عوام
سارے گم گشتہ عزیزانِ جہاں مل ہی گئے
(سردار جعفری)

ہم قبضہ کریں گے دفتر پر
ہم وار کریں گے قیصر پر
ہم ٹوٹ پڑیں گے لشکر پر
مزدور ہیں ہم، مزدور ہیں ہم
(مزدوروں کا گیت'' (مجاز)

ایک ہو کر دنیا پر وار کرسکتے ہیں ہم
خون کا بھر پور دریا پار کرسکتے ہیں ہم
کانگریس کو لیگ کو بیدار کرسکتے ہیں
زندگی سے ہند کو سرشار کرسکتے ہیں ہم
''بنگال'' (مخدوم)

آزادی، شورش، جنگ، سرخ سویرا:

وہ جنگ ہی کیا وہ امن ہی کیا؟
دشمن جس میں تاراج نہ ہو
وہ دنیا دنیا کیا ہوگی؟
جس دنیا میں سوراج نہ ہو
وہ آزادی آزادی کیا؟
مزدور کا جس میں راج نہ ہو
لو سرخ سویرا آتا ہے
آزادی کا آزادی کا
یہ جنگ ہے جنگِ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے
''جنگ آزادی'' (مخدوم)

طوفان، انقلاب:

مجاز ''نوجوان سے'' ہی نہیں بلکہ ''نوجوان خاتون سے'' بھی مخاطب ہیں۔

جلال آتش و سحاب پیدا کر　　اجل بھی کانپ اٹھ وہ شباب پیدا کر
تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر　　جو ہوسکے تو ابھی انقلاب پیدا کر
'نوجوان سے'

سنانیں کھینچ لی ہیں سر پھرے نوجوانوں نے　　تو سامانِ جراحت اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا
ترے ماتھے کا یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن　　تو اس آنچل سے ایک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا
''نوجوان خاتون سے''

''پردہ اور عصمت'' میں تو مجاز ہمارے سامنے حرفِ آخر اور حجت کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ گویا ''مستند ہے اس کا فرمایا ہوا''۔

جو ظاہر نہ ہو وہ لطافت نہیں ہے　　جو پنہاں رہے وہ صداقت نہیں ہے
یہ فطرت نہیں ہے، مشیت نہیں ہے　　کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

اس سے آگے تو وہ جناب الہامی حاکمانہ انداز اختیار کر لیتے ہیں۔ جیسے عصمت کے خالق و مالک وہی ہیں کہ اسی اندازِ جابرانہ سے قسم کھا رہے ہیں:

قسم انجم شب کے ذوق سفر کی　　قسم تازگی نسیم سحر کی
قسم آسمانوں کے شمس و قمر کی　　کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے
''پردہ اور عصمت''

یکسانیت:

اس طرح کے خیالات اس دور کے ہر شاعر کے ہاں نظر آتے ہیں وہ اس وجہ سے کہ ان کے ہاں شاعری نہیں بلکہ مقابلہ و مسابقت ہو رہی تھی اور ہر ایک کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ اس دوڑ اور تقابل میں وہ اول رہے۔ اس لیے الفاظ و تراکیب کو جمع کر کے اعتقادات کو پاش پاش کرنے میں سبقت لے جاتے ہیں۔ اسی یکسانیت نے نہ صرف اس دور کی

شاعری کا 'خون' کیا اور شاعرانہ و فنکارانہ خصوصیات کو 'آگ' لگائی بلکہ اس 'بغاوت' نے ان کی اپنی شناخت کو بھی حرف غلط کی طرح مٹایا۔ اگر اجتماعیت و اشتراکیت کا صحیح مفہوم سمجھنا ہو تو اس دور کے ترقی پسندوں کی تخلیقات کو دیکھئے کہ واقعی انھوں نے اس کا عملی ثبوت دیا ہے (اپنی شاعرانہ انفرادیت کو اجتماعیت پر قربان کر کے)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید وہ ایک ساتھ بیٹھ کر شاعری کرتے تھے اور ادب لکھتے تھے۔ کہیں اور اگر اشتراکیت (کمیونزم) کی تطبیق ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو ان کی شاعری و ادب میں تو ضرور ہوئی ہے!

جب ایک ادیب کا کینوا س ہی محدود ہو، لفظیات ہی مختصر ہوں تو وہ خیالات و مضامین کہاں سے لائے گا اسی وجہ سے ترقی پسندوں کے ہاں چند ہی الفاظ و مضامین کی تکرار بار بار ہوتی ہے، ان میں سے کچھ اہم اور کثیر المستعمل الفاظ و تراکیب کو میں یہاں بیان کرتا ہوں وہ اس لیے تا کہ اس شعری منظر نامے کے بانجھ پن اور جمود کی نشاندہی ہو سکے جس کی وجہ سے ہمارا شعری سرمایہ اضمحلال کا شکار ہو گیا مثلاً: (مخدومؔ): پیشانی میں سجدوں کا طوفاں، دوزخوں کی آگ، فریبِ سیم و زر کے کلیجے، قہر کا سیلاب، اٹھتا تلاطم، نغمے شرر فشاں، آتشیں رباب، موت کی پرچھائیاں، ظلمتوں کی چادریں، مشعلوں کی برات، مہرِ بغاوت، نجات، زنجیر کا شور، خاموش زنداں، دہکتے ہوئے رخسار، عشق کے شعلے، ذرۂ موت۔ (فیض) قحط، عیش و مسرت، غم کی ارزانی، ظلمتِ یاس، جگر کی آگ، نظر کی امنگ، دل کی جلن، حکمِ عقوبت، جرمِ وفا، ذوی العدل، سرِ دار، پنجۂ جنوں، پنجۂ صیاد، دامنِ جلاد، نالہ ہاؤ ہو، شعلۂ درد، لہو کی تال، شور کی مہک، الزام کی برسات، ملامت کی گھٹا، سلگتی صراحی، مئے زہر ہلاہل، تعزیرِ سیاست، خونِ عشاق، قتل گہ دل، تیغِ ستم گر۔ (جذبیؔ): سنسناہٹ، بجلیوں کی چمک، دلِ نازک کے طوفان، غضب آلود افسانے، توپوں کی گھن گرج، خون کی بھینٹ، برق و باد کی یورش، موت کا دیوتا، موت کا رقص، شعلوں کی لپک، کانپتی ٹوٹتی زنجیریں، چمن کی لوٹ، بجلیوں کی چشمک، لالۂ خونین کفن، شیوۂ دار و رسن، جاں فروشی، غضب ناک خیال، ہنگامۂ حیات، خاموشِ بیکساں، آبجوئے درد، جنسِ درد کی ارزانیاں، برق و باد کی بارش۔ (سردارؔ جعفری): سرخ زمیں، سرخ آسماں، بکھری ہوئی ہڈیاں، اجڑی ہوئی بستیاں، گردشِ رقص، تُند مزاج، شعلہ خو، برق و شرار، نور کا خوں نچوڑتی آتشِ بدن، خنجر کی دلداری، نفرت و نخوت کا زہر، حرص و ہوس کا رقص، حرصِ ہوا کی زنجیریں، رقصِ شرر، بادۂ سرخ، تیغِ منصف، تیغِ دوست، لہو کی پیاسی تیغ، سنگِ محتسب، چکنا چور خواب، ظلم کا ہاتھ، ستم کا وار، لہو کی بارش، شعلۂ جوالہ، آتشِ صد سالہ، شعلہ افشانی، دل کے بجھتے دہکتے

انگارے، ظلم، خوف اور موت کے سناٹے، طویل ظلم کا صحرا، جبر کا دشت، آگ کا طشت، تیرگی کی سازشیں، ہنگامہ شورِ نشور، خون آلودہ نور، خنجروں کی روشنی (مجاز) تباہی کے فرشتے، جبر کے شیطان، جنگ کا خونیں ستارہ، قلب گیتی، گولیوں کی سنسناہٹ، اجل کے قہقہے، زلزلوں کی گڑگڑاہٹ، دلدادگانِ شعلہ، ہنگامۂ جنگ، نرغۂ باطل، جلالِ آتش، برق سحاب، دہقاں کا خرمن، آشوبِ ہلاکت، گرجتا گونجتا میدان، عیش کی شورش، بغاوت کا ستارہ، بےکسوں کا نالہ، باغیوں کا زمزمۂ آتشیں، زخمی پیکانِ مژگاں، نوحہ گر، دردِ ہجراں، تشنہ کامی، تلخ کامی، گنگناتا ہوا زنبور، شعلہ افشاں وشرر، خاک وخون میں لتھڑی زندگی، زنجیر قدامت پاش پاش۔ (ساحر لدھیانوی): بے بس دکھیارے، سینوں میں طوفان کا طلاطم، آنکھوں میں بجلی کے شرارے، سرخ پھریرے، مظلوموں کے باغی لشکر۔ (جان نثار اختر): نعروں سے بغاوت، گونجتا ہوا میدان، شاہوں کے الم وغیرہ۔ اس دور کے شعری ڈکشن پر ایک آسیب کی طرح سوار ہیں۔ یہ گھڑی اور بنائی ہوئی تراکیب اس زمانے میں ہر جگہ ملتی تھیں اب شاعر کو انھیں بس فٹ کرنا پڑتا تھا۔ اس کا استحضار انھیں خود بھی تھا۔ مثلاً جذبی:

اب شاعر ہند میں جذبی، جگر کے بعد　　یہ سوچتا ہوں کوئی صاحب نظر بھی ہے

(جذبی)

''کبھی نعروں، کھری کھری باتوں، یہاں تک کہ دشنام طرازیوں کو ترقی پسندی سمجھ لیا گیا، کبھی صرف تکنیک پر اتنا زور دیا گیا کہ یہی ترقی پسندی کی علامت بن گئی۔ چنانچہ اس دوران میں جو ادب پیدا ہوا ہے اسے ہم مشکل سے ہی ادب کہہ سکتے ہیں' ترقی پسندوں کو 'مارکسی نقطۂ نظر' کے سوا کچھ اور سمجھنا سخت غلطی ہوگی''۔[۶]

جب اس تحریک کے زیر اثر لکھنے والوں نے اس طرح کا ادب (بمشکل ہی ادب) تحریر کرنے پر زور دے دیا۔ انفرادیت، غمِ جاناں اور احساس ذات کے شعور پر پابندی لگائی اور ان کو اجتماعیت کی بھینٹ چڑھا دیا تو اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ فن اپنی اس حالت اور اس منصب پر نہیں رہا کل تک جو اس کی خالص پہچان تھی اب ایک عام تحریر یا صحافتی کالم اور ادب پارے میں زیادہ فرق ہی نہیں رہا جہاں سے فن کی حدیں شروع ہوتی تھیں۔ ان سرحدوں کو ہی مٹانے کی کوشش کی گئی اور اس کے گرد دیواروں کو منہدم کر دیا گیا۔ وزیر آغا اس نقطے کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''ایک سچا ادیب بنیادی طور پر انسان دوست ہونے کے باعث استحصال اور جارحیت کی مذمت کرنے میں صدا پیش پیش ہوتا ہے۔ دِقت صرف اس وقت پیدا ہوتی ہے جب سماجی بہبود کا مقصد فنّی تقاضوں کو پس پشت ڈال دیتا ہے اور ادب اور پمفلٹ میں تمیز باقی نہیں رہتی''۔ ۷

ان شعراء وادباء کو مارکسیت واشتراکیت کی آڑ میں گمراہ کیا گیا۔ اپنا الوسیدھا کرنے کے لیے ان کو استعمال کیا گیا۔ سجاد ظہیر، محمد دین تاثیر، رشید جہاں ملک راج آنند بھی ادبی سے زیادہ سیاسی افراد تھے۔ یہ ہندوستان کی آزادی کے اتنے خواہاں نہ تھے جتنی کہ یہاں مارکیست پھیلانے کے مگر اپنی مقصد براری کے لیے ادب کے ساتھ ساتھ وہ آزادی کے ترانے بھی گانے لگے۔ ابواللیث صدیقی، آل احمد سرور اور کئی دوسرے اہم ناقدین نے بھی اس جانب پہلے ہی ہمیں توجہ دلائی تھی، آل احمد سرور کو تو اس تحریک کے بعض علمبرداروں میں بڑی سطحیت، رعونت، تنگ نظری اور قطعیت نظر آئی، ان کے مطابق بھی ان کے یہاں اہمیت سیاسی اور اقتصادی اصولوں کو ہی تھی، نیز وہ ایک اچھے ادیب کے منصب کے خلاف تھے بقول ان کے:

''انصاف کا تقاضا ہے کہ اس تحریک کے بعض علمبرداروں میں بڑی سطحیت، بڑی رعونت، بڑی تنگ نظری، بڑی قطعیت ہے۔ یہ زندگی کو سیاسی فارمولوں اور اقتصادی اصولوں کے سوا کچھ نہیں سمجھتے۔ یہ اب سے دس سال پہلے جو کچھ لکھا گیا ہے اسے حرفِ غلط کی طرح مٹانا چاہتے ہیں اور یہ ایک اچھے ادیب کے منصب کے خلاف ہیں۔ یہ ایک ذہنی غلامی سے نکال کر دوسری ذہنی غلامی میں انسان کو مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ فن سے ناواقفیت کو آرٹ سمجھتے ہیں اور طوائف کو ہیروئین، یہ مذہب اخلاق اور تہذیب کو آثارِ قدیمہ کہتے ہیں۔ اور مارکس کو انسانیت کا ''حرف آخر''۔ ۸

یہ چوں کہ خود سرمایہ دار تھے اپنے اسی سرمائے کے بل بوتے پر یہاں جلسے جلوس منعقد کرائے، پارٹیاں بنائیں، اور ''انگارے'' و ''شعلے'' لکھ کر بے وقوفوں کو چونکا دیا۔

ان تمام خامیوں کے باوجود یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس تحریک کی بدولت سماجی انصاف کی ضرورت کا احساس اور استحصال کی بیخ کنی کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس نے خیال وخواب کی دنیا سے نکال کر زندگی کے عام مسائل، زمینی حقائق اور صورت حال کا جائزہ لینے کی طرف مائل کیا، یاس کے تاریک غاروں میں اس نے ناامیدوں کو

انقلاب کی امید کی کرن دکھائی اوران کے اندر تبدیلی کا جذبہ پیدا کیا۔ان کی سب سے بڑی خوبی رجائیت تھی۔گرچہ وہ شخصی طور پر لاکھ برے سہی مگر جذبی طور پر وہ پراُمید و پروقار تھے۔انھوں نے کبھی بھی اُمید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، انتظار کی طویل راتوں کی سختی برداشت کی۔اپنی دل بہلائی کے لیے مسلسل شاعری کرتے رہےاوررات کی سنگین تاریکی کوسپیدۂ سحر قرار دیتے رہے۔سردارؔ جعفری کی نظم ''میراسفر'' رجائیت کی عمدہ مثال ہے بلکہ اس میں آئیندہ آنے والے اشتراکی نظام کا خواب اوراس خواب کی حسین تعبیر ہے:

لیکن میں یہاں پھر آؤں گا　　بچوں کے دہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زباں سے گاؤں گا　　جب بیج ہنسیں گے دھرتی میں
اور کونپلیں اپنی انگلی سے　　مٹی کی تہوں کو چھیڑیں گی
میں پتی پتی، کلی کلی　　اپنی آنکھیں پھر کھولوں گا
''میراسفر'' (سردارؔ جعفری)

انقلاب آئے گا رفتار سے مایوس نہ ہو　　بہت آہستہ نہیں ہے جو بہت تیز نہیں ہے
(سردارؔ جعفری)

دھڑکتے دلوں کی صدا آرہی ہے　　اندھیرے میں آوازِ پا آرہی ہے
بلاتا ہے کوئی ندا آرہی ہے　　چلا آرہا ہے چلا آرہا ہے
''مستقبل'' (مخدومؔ)

تاریک رات اور بھی تاریک ہوگئی　　اب آمدآمدِ روشن قریب ہے
(جذبیؔ)

یہ کس نے چھیڑ دیا ذکر نامرادی کا　　یہاں کوئی دل امید وار بھی ہوگا
جذبیؔ

ان مثالوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ترقی پسندی سے ہٹ کر جہاں وہ ہمارے سامنے بحیثیت شاعر ہیں وہاں وہ کتنا عمدہ ادب تخلیق کرنے پر قادر ہیں۔یہ اشعار اپنی نہاد میں ترقی پسند تحریک کے منشور کا عملی اظہار ہیں۔سردارؔ جعفری،

فیضؔ، مجازؔ، ساحرؔ، جذبیؔ، مخدومؔ، جیسے سربرآوردہ شعرا کی تخلیقی کاوشوں سے ہی ترقی پسند تحریک کی شعری جمالیات کی تعمیر وتشکیل ہوئی ہے۔

☆☆☆☆☆

## حوالہ جات:


1. Carlo Coppla, The all-India progressive writers accociation: the early phases, comprises, Carlo Coppola, Marxist influence and south Asian literature (Delhi: Chanakya Publications, 1988)18

۲۔ مرتب، خالد علوی، انگارے کا تاریخی پس منظر، مشمولہ، انگارے (دلی: عالمی میڈیا پرائیوٹ لمٹیڈ ۲۰۱۴ء) ۵۹

3. Ahmed Ali, The progressive Writers movement and creative writers in Urdu, comprises, Carlo Coppola, Marxist influence and south Asian literature (Delhi: Chanakya Publications, 1988) 43-44

۴۔ ہنس راج رہبر، ترقی پسند ادب ایک جائزہ (دہلی: آزاد کتاب گھر ۱۹۶۷ء) ۳۲۲

۵۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک (علی گڈھ ایجوکیشنل بک ہاوس، ۲۰۰۷ء) ۱۷۵

۶۔ معین احسن جذبی، چند باتیں، مشمولہ، کلیات جذبی (دلی: ساہتیہ اکادمی ۲۰۰۶ء) ۱۵

۷۔ وزیر آغا، تنقید اور مجلسی تنقید (لاہور: آئینہ ادب ۱۹۸۱) ۱۶۸

۸۔ آل احمد سرور، نظم کی دنیا، مشمولہ اردو شاعری کا فنی ارتقاء (دلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس ۲۰۰۸) ۱۳۹


☆☆☆☆☆☆☆

## بنیادی ماخذات


اسرار الحق مجاز، کلیات مجاز (دلی: کتابی دنیا ۲۰۰۶ء)

## ترسیل

ساحرلدھیانوی کلیات ساحیر (لاہور: مکتبہ خزینہ علم)
سردار جعفری، ایک خواب اور (دلی: مکتبہ جامع لمٹیڈ ۲۰۱۱ء)
فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا (کلیات) (دلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ۲۰۱۲ء)
مخدوم محی الدین، کلیات (دلی: فرید بک ڈپو، ۲۰۱۱ء)
معین احسن جذبی، کلیات جذبی (دلی: ساہیتہ اکادمی ۲۰۰۶ء)

☆☆☆☆☆☆☆

رابطہ

ڈاکٹر محمد امتیاز احمد

اسسٹنٹ پروفیسر اُردو

محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ جموں وکشمیر

اِی میل: tamana866@gmail.com

موبائل: 9797289295 +91